علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
تقسیم کے بعد

(۱۵)

از سعید احمد اکبر آبادی

بدرالدین طیب جی کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم نہیں ہے کہ ان کا گورنمنٹ میں عمل دخل کافی تھا اور خصوصاً پنڈت جی کو ان پر بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا اور ان کی قدر کرتے تھے اس بنا پر انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیکر اس کی کوشش کی کہ علی گڑھ کے نوجوان سرکاری ملازمتوں میں لئے جائیں اس کے علاوہ کمپنیوں سے خط و کتابت کر کے بہت سے نوجوانوں کو وہاں بھی بھیجا۔ پنڈت جی سے کہہ سن کر سرکاری طور پر اس کی تحقیق کرائی کہ مسلمان ملازمتوں میں اپنی آبادی کے تناسب سے کیوں بہت کم ہیں۔ مجھے خود اپنے ایک عزیز شاگرد کا واقعہ یاد ہے، یہ نہایت ذہین اور طباع۔ ساتھ ہی بہت نیک اور صالح نوجوان تھا۔ یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کیا اور فیکلٹی آف تھیالوجی کا امتحان بی ٹی۔ ایچ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ میں نے اپنے ہاں اس کو تھیالوجیکل سوسائٹی کا سکرٹری بھی بنا دیا تھا۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر ایک آل انڈیا مقابلہ کے سخت امتحان میں شریک ہوا اور اس شان سے کامیاب ہوا کہ نو سو کامیاب امیدواروں میں یہ اکیلا مسلمان تھا۔ اس کے بعد نو مہینہ کی ٹریننگ تھی اس میں بھی اعلیٰ درجہ میں کامیابی

حاصل کی، تمام افسران متعلقہ اسے بہت پسند کرتے تھے، لیکن جب تقرر کا وقت آیا تو پولس رپورٹ اس کے خلاف ہوگئی اور اس کا نام خارج ہوگیا، یہ سخت پریشان اور بدحواس ہوکر میرے پاس پہونچا۔ میں نے بدرالدین طیب جی سے ملایا تو انھوں نے پہلے یونیورسٹی کے کیرکٹر سرٹیفکٹ کی روشنی میں مجھ سے اور پرووسٹ اور پراکٹر سے یہ تحقیق کی کہ پولس کی رپورٹ غلط تھی اور اس نوجوان کا تعلق کبھی کسی فرقہ وارانہ جماعت سے نہیں رہا۔ بدرالدین طیب جی کو جب اس بارہ میں اطمینان ہوگیا تو انھوں نے فوراً ٹیلیفون اٹھایا اور پنڈت جواہرلال نہرو سے بات چیت کرکے ان کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ پنڈت جی نے فوراً فائل منگوالیا۔ جب پولس رپورٹ سامنے آئی تو حکم دیا کہ اس کا ثبوت فراہم کیا جائے، پولس کو دن میں تارے نظر آنے لگے، علی گڑھ آئی، کئی روز تک یہاں پڑی رہی لیکن اس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور وہ اپنی رپورٹ کو صحیح ثابت نہ کرسکی، اس کے بعد پولس کے ان ذمہ دار افسروں کا حشر کیا ہوا؟ اس کا علم تو نہ ہوسکا لیکن یہ نوجوان اللہ کے فضل وکرم سے آج ایک بڑے عہدہ پر فائز ہے اور بڑی نیک نامی سے اپنے فرائض مفوضہ انجام دے رہا ہے! اس سے معلوم ہوا کہ آج مسلمانوں کی وہ کونسی مشکل ہے جو دور نہیں ہوسکتی، بس ضرورت اس کی ہے کہ ان کی قیادت صحیح ہو۔ اور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو بدرالدین طیب جی کی طرح خالص تعمیری ذہن رکھتے ہوں، مخلص اور تجربہ کار ہوں اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھ بیدار مغز اور نہایت جری اور بیباک ہوں۔

نواب علی یاور جنگ

جب یہ طے ہوگیا کہ بدرالدین طیب جی علی گڑھ میں نہیں رہیں گے تو ایک روز نواب سر احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری نے ہم چند اکزکٹو کونسل کے مقامی ممبروں کو شام کی چائے پر مدعو کیا اور وہاں بتایا کہ اب علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ کے لئے نواب علی یاور جنگ کا نام در پیش ہے اور پھر موصوف کے تعارف میں بتایا کہ بڑے لائق اور قابل ہیں۔ جامعۂ عثمانیہ کے وائس چانسلر اور گورنمنٹ آف انڈیا کے بڑے بڑے سفارتی عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ میں نے عرض کیا: یہ تو سب درست اور بجا! لیکن آپ

کا حیدر آباد سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، اس لئے یہ بھی فرمائیے کہ نواب علی یاور جنگ کو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا بھی پاس اور لحاظ رہے گا! نواب صاحب چھتاری میرا یہ سوال سنتے ہی جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے، لیکن جلد ہی سنبھل کر بولے : "میں ذاتی طور پر خوب واقف ہوں، بہت شریف اور مسلمان آدمی ہیں"۔ مجکو بچپن اور خواہ مخواہ اپنی بات کی پچ کرنے سے سخت نفرت ہے، اس لئے جب کسی شخص کی گفتگو کے بین السطور سے میں اس کا اصل مقصد تاڑ لیتا ہوں تو اب اپنی بات کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں اور مزید بحث و تکرار نہیں کرتا۔ چنانچہ اس وقت بھی میں خاموش ہو گیا۔ دوسرے حضرات کچھ کہتے سنتے رہے اور مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد مجلس منتشر ہو گئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے مطابق اکزکٹو کونسل کی میٹنگ ہوئی اس میں تین آدمیوں کا ایک پینل بنا اور صدر جمہوریہ نے وزیٹر کی حیثیت سے سے اس پینل سے نواب علی یاور جنگ کا نام منتخب کرکے وائس چانسلر مقرر کر دیا۔

یونیورسٹی کی تاریخ کا سب سے زیادہ المناک واقعہ نواب صاحب نے مارچ ۱۹۶۵ء میں اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ نہایت افسوس اور رنج کی بات ہے کہ ابھی پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۲۵ اپریل کو یونیورسٹی کی تاریخ کا وہ سب سے زیادہ المناک واقعہ پیش آیا جس نے یونیورسٹی کی ہیئت ہی بدل دی اور اس کو ایسے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا جن کے اثرات و نتائج سے یونیورسٹی کو اب تک نجات نہیں ملی۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یہ مشہور اور نہایت بدنام واقعہ ہے اور مختلف لوگوں نے اس کی تعبیر و تشریح میں مختلف باتیں کہی ہیں، لیکن چونکہ میں خود اس وقت موجود تھا اس لئے اپنے مشاہدات و احساسات کی روشنی میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، بدرالدین طیب جی نے انجینئرنگ کالج میں داخلہ کے لئے خود یونیورسٹی کے طلبا کے لئے ۷۵ فی صد کا کوٹہ مقرر کر دیا

تھا اور اس کی منظوری پہلے اکاڈمک کونسل اور پھر اگزکٹو کونسل اور کورٹ سے لے لی تھی۔ نواب علی یاور جنگ نے چارج لینے کے بعد ہی اس چیز کو قومی مفاد کے خلاف سمجھا اور اسے ختم کرنے کے لئے انھوں نے اکاڈمک کونسل میں اس کی تحریک کی کہ اندرونی اور بیرونی طلبہ کے لئے ۷۵ اور ۲۵ کا تناسب ختم کر دیا جائے اور اسے یونیورسٹی کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ اکاڈمک کونسل نے اسے منظور کر لیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نواب صاحب کا یہ اقدام مُسلمان طلبا کے مفاد کے خلاف تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اندرونی اور بیرونی طلبا میں مُسلم اور غیر مُسلم کی کوئی تخصیص نہیں تھی، اس لئے اگر اندرونی طلبا کے لئے ۷۵ فی صد کا کوٹہ مقرر ہوتا ہے تو اس سے مُسلم اور غیر مُسلم دونوں قسم کے طلبا کو فائدہ پہونچتا ہے اور بیرونی طلبا کے لئے ۲۵ فی صد کے کوٹہ سے اگر ان کو نقصان پہونچتا ہے تو اس میں دوسری یونیورسٹیوں سے آنے والے مُسلم اور غیر مُسلم دونوں طلبا شریک ہیں، چنانچہ مجھے معلوم ہے نواب صاحب نے اکاڈمک کونسل میں اپنی تجویز پیش کرنے سے قبل انجینئرنگ کالج کے پرنسپل جناب ضیاءالدین صاحب انصاری اور کالج کے سینئر پروفیسروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ کیا ان کی اس تجویز سے مسلمان طلبا کے داخلہ پر اثر پڑے گا تو ان حضرات نے کافی غور و خوض اور گذشتہ ریکارڈ کو دیکھنے اور اس کے مطابق اندازے لگانے کے بعد بتایا کہ مسلمان طلبا کے داخلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ اندرونی طلبا کی تعداد کم کرنے سے بیرونی طلبا کی جو تعداد بڑھے گی اس میں مسلمان طلبا بھی ہوں گے، اس بنا پر میرے نزدیک نواب صاحب کی تجویز کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے دیکھنا درست نہیں ہے۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر یہ معاملہ مقامی اور یونیورسٹی کے اپنے طلبا کے حق کا تھا، ہر یونیورسٹی کے طلبا اپنا یہ ذاتی حق

سمجھتے ہیں کہ ان کی یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج اور دوسرے پروفیشنل تعلیم کے اداروں اور کالجوں میں داخلہ کے معاملہ میں ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے، چنانچہ اکثر و بیشتر یونیورسٹیوں میں ایسا ہوتا بھی ہے، اس بناپر اکاڈمک کونسل میں جب نواب صاحب کی تجویز منظور ہوئی تو طلبا میں اس سے بیزاری اور ناراضگی کا پیدا ہونا ایک امرِ طبعی تھا، چنانچہ انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا' لیکن یہ احتجاج نہایت پرامن تھا۔ ۲۴؍اپریل کو اکزکٹو کونسل کی میٹنگ تھی۔ میں خود اس میں شریک تھا، جب میٹنگ ہو رہی تھی تو طلبار نے ایک جلوس نکالا اس وقت پراکٹر پالٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کے ریڈر ناصر علی صاحب تھے، یہ نہایت مستعد، بیدار مغز اور طلبار کے ہمدرد تھے، یہ ڈیوٹی پر تھے اور نگرانی کر رہے تھے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ انھوں نے طلبار کو سمجھا بجھا کر منتشر کر دیا اور میٹنگ چلتی رہی، میٹنگ میں نواب صاحب نے اپنی تجویز پر تقریر کرتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی اس سے مسلم مفاد پر کوئی اثر نہ ہوگا، لیکن جسٹس بشیر احمد سعید اور دوسرے حضرات کو اس معاملہ میں اطمینان نہیں تھا اور وہ انجینرنگ کالج میں گذشتہ چند برس کے داخلوں کی روئداد وغیرہ کی روشنی میں اس پر مزید غور و فکر کرنا چاہتے تھے اس لئے محض غیر رسمی گفتگو کے بعد اس کو ملتوی کر دیا گیا اور اس بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔

دوسرے دن یعنی ۲۵؍اپریل کو کورٹ کی میٹنگ تھی جو حسب معمول و دستور حامد ہال (یا طلبار کی یونین کے ہال) میں منعقد ہوئی، قاعدہ اور ضابطہ کے مطابق میٹنگ کا افتتاح قرآن مجید کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد نئے وائس چانسلر کے خیر مقدم میں تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا عبدالوہاب بخاری، سید کلب عباس صاحب اور بعض اور حضرات نے حصہ لیا۔ ان سب کے جواب میں وائس چانسلر نے مختصر تقریر کی جس میں شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ انھیں اس کا احساس ہے کہ اس یونیورسٹی کی تاریخی عظمت کیا ہے، اس کی روایات کیا ہیں، وہ کوشش کریں گے کہ اس کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں، اور اسی جذبہ سے وہ یہاں آئے ہیں۔

اس کے بعد ایجنڈے پر کارروائی شروع ہوئی۔ ابھی چند ہی آئیٹم ہوئے تھے کہ طلبار کا ایک بڑا جلوس یونین کے صدر کے زیر قیادت وہاں پہونچ گیا اور اس نے یونین ہال کے شمالی دروازے کے سامنے دھرنا جما دیا۔ ان لوگوں کا مطالبہ یہ تھا کہ کورٹ اپنی اس میٹنگ میں اکاڈمک کونسل کی منظور کردہ تجویز متعلقہ کو رد کر دے اور اس کا اعلان کرے کہ سابقہ پوزیشن بحال رہے گی۔ طلبار کا یہ جلوس مسلم اور غیر مسلم دونوں طلبار پر مشتمل تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے اس جلوس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کرسی پر ممبران کورٹ کی طرف رخ کئے جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ حد یہ ہے کہ طلبار کی طرف گردن موڑ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ کتنے طلبار ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ بعض اساتذہ نے ہال سے باہر نکل کر ان سے گفتگو کی۔ مگر نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے، آخر کار جب شور وغل زیادہ بڑھا تو وائس چانسلر صاحب نے پراکٹر کو بلا کر پولس کو طلب کر لینے کی ہدایت کی اور میٹنگ ملتوی کر دی گئی، میٹنگ کے ملتوی ہوتے ہی ممبر حضرات منتشر ہو گئے اور جس کا جدھر سینگ سمایا چل دیا۔ لیکن وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، نواب صاحب چھتاری اور چند پروفیسر اور دوسرے ممبر ہال میں ہی رہے اور میں بھی انھیں حضرات میں شامل تھا۔ پراکٹر کے ٹیلیفون کرنے پر دس پندرہ منٹ کے اندر اندر پولس پہونچ گئی، طلبار نے کورٹ کی طرف سے مایوس ہو کر ہال کے اندر گھس کر پتھراؤ شروع کر دیا تھا۔ جب اس میں شدت ہوئی تو میں اپنی حفاظت کے لئے ہال کے پچھلے حصہ میں بازو کے کمرہ کے قریب ایک اونچی سی میز رکھی تھی اس کے نیچے گھس گیا لیکن جب دیکھا کہ پتھراؤ بڑھتا ہی جاتا ہے اور طلبار آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں تو میں میز کے نیچے ہی نیچے رینگتا ہوا بازو کے کمرہ میں گھس گیا۔ یہاں دیکھا کہ پروفیسر نور الحسن، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محیب الرحمٰن اور چند اور حضرات بھی اسی کمرہ میں پناہ گزین تھے۔ ادھر ہم لوگ یہ جمناسٹک کر رہے تھے اور ادھر ہوا یہ کہ طلبا نے پولیس کو دیکھا تو اس پر بھی پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولس نے فوراً گولی چلا دی جس سے بعض طالب علم زخمی ہوئے لیکن مشہور یہ ہو گیا کہ دو طالب علم جاں بحق ہو گئے۔ اس خبر کا اڑنا تھا کہ طلبار آپے سے باہر ہو گئے اور اب انھوں

نے ہال کا یہ مشرقی بازو والا کمرہ جس میں ہم پناہ گزیں تھے اس کو اپنا نشانہ بنایا۔ کمرہ اندر سے بند تھا اس لئے اس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر اس زور شور سے پتھراؤ کیا کہ ان کے شیشے ٹوٹ ٹوٹ کر ہم لوگوں کے اِدھر اُدھر تابڑ توڑ گرنے لگے اور بچنا مشکل ہوگیا۔ اب میں نے یہ کیا کہ جن دو کھڑکیوں سے پتھر اندر آرہے تھے میں ان دونوں کھڑکیوں کے بیچ کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا، اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ میرے بعض ساتھی شیشہ یا پتھر لگنے سے زخمی ہوگئے اور میں محفوظ رہا، لیکن پتھراؤ میں لمحہ بہ لمحہ جو شدت مزید سے مزید تر پیدا ہوتی جارہی تھی اور لڑکے غصہ میں بھرے ہوئے جو چیخ پکار کررہے تھے اس کی وجہ سے یقین تھا کہ آج اگر جان بچ بھی گئی تو صحیح سلامت گھر پہونچنا ناممکن ہے، خیال تھا کہ کھڑکیوں کے شیشے تو ٹوٹ ہی گئے ہیں، اب لڑکے ان میں سے پھاند کر اندر گھس آئیں گے، اور اپنا غصہ ہم پر اتاریں گے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یکایک لڑکوں کا شور وغل ختم ہوگیا اور وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف چلے گئے، میں نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور کمرہ سے نکل کر پھر ہال میں داخل ہوا۔ اس وقت ہال میں بالکل سناٹا تھا۔ لیکن یہ دیکھکر سخت تعجب ہوا اور حیرت بھی کہ مسٹر پی۔ این سپرو جو ملک کی ایک مشہور اور بلند پایہ شخصیت تھے اور جو کورٹ کے ممبر تھے اپنی سن رسیدگی اور ضعیف کے باوجود کورٹ کی میٹنگ میں جہاں بیٹھے تھے اب بھی تن تنہا اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، ہال میں پتھراؤ ہوتا رہا۔ سب تتر بتر ہوگئے، لیکن سپرو صاحب نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی، میں نے اس وقت انکو صحیح سلامت دیکھا تو دل ہی دل میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کیا ورنہ خدانخواستہ اگر ان کا بال بیکا ہوجاتا تو معلوم نہیں کیا قیامت برپا ہوجاتی، بہرحال اس وقت پروفیسر آل احمد سرور میرے ساتھ تھے، ہم دونوں نے ہال سے باہر نکل کر دیکھا تو اس وقت لڑکوں کی بھیڑ تھی، اسے غنیمت جانا اور ہم دونوں لپک کر ایس ایس ہال کے ڈائننگ ہال میں گھس گئے، باہر پہلے شور وغل کی آواز آئی اس کے بعد یہ آواز مدھم پڑگئی اندر سے ہمیں کوئی اندازہ نہ ہوسکا کہ باہر کیا ہورہا ہے، دس پندرہ منٹ اسی امید وبیم کے

کے عالم میں گذرے۔ اس کے بعد ہم دونوں نے باہر جھانک کر دیکھا تو راستہ صاف نظر آیا۔ ہم دونوں کی رائے ہوئی کہ اب نکل چلنا چاہئے۔ چنانچہ مرور صاحب اپنے گھر کی طرف چلے اور راستہ میں زخمی ہو گئے۔ میں اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی سڑک پر آیا تھا کہ ایک چپراسی سائیکل پر وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو فوراً سائیکل سے اتر کر مجھے اس پر بٹھا لیا اور بڑی تیزی سے سائیکل چلا کر مجھے میرے گھر پہونچا دیا۔ یہاں گھر کے لوگ سخت پریشان تھے، مجھے بخیریت وعافیت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

وائس چانسلر صاحب کے ساتھ نہایت افسوسناک معاملہ

یہ تو اس واقعہ کی آپ بیتی ہے جو خود پر گذری، شام کے وقت جو دوست احباب میری خیریت طلبی کے لئے آئے ان سے یہ معلوم کر کے سخت دکھ اور صدمہ ہوا کہ نواب علی یاور جنگ شدید زخمی ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے بھی شدید چوٹیں آئیں۔ میں نے یونین ہال میں پتھراؤ کے وقت اپنا بچاؤ کرتے ہوئے نواب صاحب کو اس حالت میں چھوڑا تھا کہ وہ، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور شاید نواب چھتاری بھی، کے ساتھ ہال کے پیچھے کی جانب کھڑے ہوئے تھے، اس وقت نہایت اعلیٰ قسم کے سوٹ میں ملبوس تھے اور سگرٹ پر سگرٹ پیتے جا رہے تھے غالباً ان کو خیال یہ تھا کہ پولیس یہاں پہونچے گی اور ان کو سلامتی کے ساتھ اپنی حفاظت میں نکال کر لے جائے گی، اور واقعہ یہ ہے کہ پولس کو ایسا کرنا بھی چاہئے تھا۔ لیکن پولیس خود اپنی خیر منانے لگی اور فیمن گیٹ کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی، پولس کی فائرنگ سے دو لڑکوں کے مر جانے کی جب شہرت عام ہوئی تو لڑکوں میں اشتعال بڑھا اور وہ نواب صاحب کو زدوکوب کرتے ہوئے ایس۔ ایس ہال کی طرف لے گئے اور وہاں ایک کمرہ میں بند کر دیا۔ مقصد مجبور کر کے ان سے اکاڈمک کونسل کے منظور کردہ رزولیوشن کو منسوخ کرنے کی ایک تحریر کا حاصل کرنا تھا۔ جب انھوں نے یہ تحریر حاصل کر لی تو چونکہ کمرہ کے باہر طلباء کا بڑا ہجوم تھا اور اندیشہ

تھا کہ کون کیا کرے، اس بنا پر کرہ کے اندر جو طلبا رتھے انھوں نے کرہ کی پشت کے جانب سے جہاں یونیورسٹی ہسپتال کی ایمبولنس پہلے سے کھڑی تھی۔ ایک کھڑکی کی سلاخیں ہٹا کر نواب صاحب کو کمرہ سے باہر کر دیا اور نواب صاحب ایمبولنس میں لیٹ کر اپنی کوٹھی پہونچ گئے۔ نواب صاحب کو ضربات شدید آئی تھیں، تمام کپڑے خون سے تربتر ہو رہے تھے۔ بیگم صاحبہ نے نواب صاحب کو اس عالم میں دیکھا تو ہوش وحواس اڑ گئے، پھر بھی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اتنے میں سول سرجن اور بعض اور ڈاکٹر پہونچ گئے انھوں نے مرہم پٹی کی، دوسرے دن صبح کے وقت نواب صاحب دہلی آکر ڈاکٹر سین کے مشہور نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے، کم وبیش دو مہینہ یہاں قیام رہا۔ اس عرصہ میں میں بھی وقتاً فوقتاً مزاج پرسی کی غرض سے نرسنگ ہوم میں آتا رہا۔ رجسٹرار اور پراکٹر وغیرہ بھی دفتری کاغذات اور فائلوں کے ساتھ یہاں آتے رہتے تھے نواب صاحب ان سے گفتگو کرتے، فائل دیکھتے اور ان پر نوٹ لکھتے تھے۔ یعنی دفتری کام یہیں سے انجام دیتے تھے۔

واقعہ کا تجزیاتی مطالعہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نواب صاحب کے ساتھ یہ جو کچھ ہوا بہت برا ہوا اور اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے، لیکن اگر پورے واقعہ کا مطالعہ تجزیاتی طور پر کیا جائے تو اس کے مختلف پہلو اور گوشے ایسے نظر آتے ہیں جو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں اور عبرت آموز بھی ہیں۔ ذیل میں ان کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے!

(۱) یہ تسلیم ہے کہ نواب صاحب کا جو منصوبہ تھا اس کا مقصد مسلم مفاد کو نقصان پہونچانا نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایسا کونسا اہم امر تھا کہ نواب صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے اس کو سرانجام کرنا ضروری خیال فرمایا۔ مجھے یاد ہے کہ اکزکٹو کونسل کی میٹنگ میں جب اس معاملہ پر غیر رسمی گفتگو ہو رہی تھی تو نواب صاحب نے فرمایا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے ان سے چند ممبران پارلیمنٹ نے کہا تھا: "نواب صاحب! اس جمہوریت کے دور میں یہ کیسے مناسب ہے کہ علی گڑھ کے انجینئرنگ کالج میں داخلہ کے لئے پچھتر فی صد نشستیں خود علی گڑھ کے طلباء کے لئے

مخصوص کردی جائیں اور باہر کے طلباء کے لئے خواہ وہ کیسے ہی قابل اور مستحق ہوں صرف پچیس نشستیں رکھی جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود نواب صاحب کے ذہن میں اُن کے اس منصوبہ کی کوئی واضح اہمیت نہیں تھی، اور انھوں نے صرف معترضین کی زبان بند کرنے کے لئے یہ اقدام کیا تھا، لیکن نواب صاحب کو اول تو یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ جس چیز کو ان کے پیش رو (بدرالدین طیب جی) ابھی دو برس پہلے کر چکے ہیں اُس کو آتے ہی اس قدر جلد منسوخ کر دینا کس طرح قرین مصلحت یا دستوری آداب وضوابط کے مطابق ہو سکتا ہے اور پھر ان کو یہ نفسیاتی حقیقت بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیئے تھی کہ جب آپ کسی کو کوئی حق دیں تو اس وقت خوب اچھی طرح سوچ بچار کر لیجئے کہ ایسا کرنا درست ہے یا نہیں۔ لیکن جب ایک مرتبہ آپ نے کسی کو ایک حق دے دیا تو اب اس سے بحث نہیں کہ یہ حق اُس شخص کا واجبی تھا یا نہیں۔ بہرحال اب اس کا واپس لینا آسان نہیں ہے، اور اگر آپ نے اس پر اصرار کیا تو لڑائی جھگڑے کا قوی اندیشہ ہے۔ اس موقع پر مجھے خود اپنا ایک واقعہ یاد آیا آپ بھی سن لیجئے، جب فروری ۲۹ء میں میں نے کلکتہ مدرسہ کا چارج لیا اور مدرسہ کی گورننگ باڈی کی میٹنگ بلائی اور اس کے سامنے دوسری باتوں کے ساتھ سال بھر کی تعطیلات کی فہرست بھی پیش کی جس میں میں نے آخری چہار شنبہ کی تعطیل جو پہلے ہمیشہ ہوتی آئی تھی حذف کر دی تھی تو خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد موسیٰ چیرمین گورننگ باڈی نے اس فہرست پر نگاہ ڈال کر حیرت سے مجھے دیکھا اور بولے: "پرنسپل صاحب! سچ بتائیے، آپ یہاں رہنے کے لئے آئے ہیں یا جلد ہی واپس ہو جانے کا ارادہ ہے"۔ میں نے عرض کیا: "میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں" فرمایا "آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کے نزدیک آخری چہار شنبہ کے دن کی کیا اہمیت ہے! آپ نے آتے ہی اسے ختم کر دیا۔ اگر آپ نے اس دن تعطیل نہیں کی تو میں بتائے دیتا ہوں کہ پبلک میں آپ کے خلاف اس قدر ایجی ٹیشن ہوگا کہ آپ کا رہنا مشکل ہو جائے گا۔" میں نے فوراً خان بہادر صاحب کی بات مان لی اور اس دن کو بھی تعطیلات کی فہرست میں شامل کر لیا، لیکن ایک کانگریسی مسلمان ممبر اسمبلی

نے یہ خبر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کو بھی پہونچادی انھوں نے مجھ سے خوان پر کہا: آپ اترپردیش سے آئے ہیں اور بنگالی مسلمانوں کی روایات اور جذبات سے واقف نہیں ہیں، اس لئے میں آپ سے کہوں گا کہ ذرا سنبھل کر چلیئے، جلد بازی نہ کیجئے، اور اب تک جیسا کچھ ہوتا آیا ہے اس میں تغیر تبدل نہ کیجئے۔

خان بہادر صاحب نے جو بات کہی تھی اُس کی تصدیق اس وقت ہوئی جب چند برسوں کے بعد سر ڈینی سن راس، جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل رہے تھے، ان کی خود نوشت سوانح عمری میری نظر سے گذری، اس میں موصوف نے ایک جگہ لکھا: "میں نے ایک مرتبہ کلکتہ مدرسہ میں بعض غیر ضروری چھٹیاں کم کر دیں تو نواب عبداللطیف (بنگال کی ایک نامور شخصیت) کو اس درجہ ناگواری ہوئی کہ انھوں کے اکسانے پر ایک گروہ نے میرے مکان پر حملہ کر دیا اور مجھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔" نواب علی یاور جنگ سے یہ حقیقت اس لئے اوجھل ہو گئی تھی کہ وہ نواب آدمی تھے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہے تھے، عوام سے ان کا ربط ضبط نہ رہا تھا۔

(۲) ۲۴ر اپریل کو جب اکزکٹو کونسل کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ طلبار نے ایک جلوس نکالا، لیکن پرامن رہے اور پر اکٹر کے سمجھانے بجھانے پر منتشر ہو گئے، پھر جب ۲۵ر اپریل کو کورٹ کی میٹنگ کے وقت یہ پھر جلوس کی شکل میں آئے تو اب بھی یہ پرامن تھے، اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ وائس چانسلر صاحب خود اٹھ کر آتے، ان لڑکوں سے خطاب کرتے، ان کی سنتے اور اپنی کہتے۔ ہم تمام ممبران کورٹ وائس چانسلر صاحب کی مدد کے لئے موجود تھے، لیکن وائس چانسلر صاحب نے گویا طلبار کے آنے اور بیٹھنے کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ جب طلبار کا شور وغل زیادہ بڑھا تو میٹنگ کی کارروائی روک دی، لیکن اب بھی کرسی پر سامنے کی طرف رُخ کئے تشریف فرما رہے اور سگریٹ پیتے رہے، میرے نزدیک یہ دوسری نامناسب بات تھی جو نواب صاحب صاحب کی طرف سے پیش آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر زیدی صاحب یا بدرالدین طیب جی

ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے۔

(۳) اس میں شبہ نہیں کہ یونیورسٹی میں بعض اوقات حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ پولیس کا طلب کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے، لیکن تعلیم گاہوں کا تقدس اس امر کا مقتضی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو پولیس کو ان معاملات میں دخل انداز نہ ہونے دیا جائے، نواب صاحب نے جس وقت پراکٹر کو پولیس طلب کرنے کا حکم دیا ہے، میرے نزدیک ان کا یہ حکم قبل از وقت تھا، کیونکہ اب تک طلبار کی طرف سے تشدد کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا اور موقع تھا کہ باہم گفت وشنید سے معاملہ ختم ہو جاتا۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جب کہ امرِ زیر بحث پر اکزکٹو کونسل نے کوئی گفتگو ہی نہ کی تھی اور اس بنا پر یہ معاملہ کورٹ کے سامنے آ ہی نہیں سکتا تھا۔ اکاڈمک کونسل نے بیشک ایک تجویز منظور کر لی تھی، لیکن اکزکٹو کونسل اور پھر کورٹ کی منظوری کے بغیر تو اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں چونکہ ہال کے اندر تھا، اس لئے باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ لڑکوں نے تشدد پولیس کو دیکھکر اور اس سے مشتعل ہو کر شروع کیا تھا۔ اور جب تشدد شروع ہی کر دیا تو پولیس بھی اس کی لپیٹ میں آ گئی اور پولیس نے اپنے دفاع میں گولی چلا دی[له]۔

له ملک اظہار الحق جو آج کل یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار ہیں میرے زمانہ میں کلکتہ مدرسہ کے ہڈ کلرک اور اس حیثیت سے میرے اسسٹنٹ تھے ان سے اور کلکتہ کے باخبر حضرات سے دریافت کیجئے کہ میرے دہ سالہ قیام کلکتہ کے زمانہ میں کتنی مرتبہ لڑکوں نے میرے خلاف اسٹرائک کی، سخت ایجی ٹیشن کیا۔ جلوس نکالے اور میرے خلاف نعرے لگائے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ بنگالی لڑکوں نے مجھ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا، لیکن میں نے کبھی پولیس کی مدد طلب نہیں کی، اور خود ہی طلبار سے گفت وشنید کر کے مگر اپنے فیصلہ پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے تمام ہنگامے ختم کئے۔ بلکہ ایک مرتبہ میرے چارج لینے کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۴) اچھا! اگر پولس کو طلب کیا گیا بھی تھا تو اس کو بتانا چاہئے تھا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے؟ اسے کیا کرنا ہے؟ اور اسے کہاں کھڑا ہونا ہے؟ اس کو طلب کر کے یونہی چھوڑ دینے اور اس سے تعلق نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِدھر وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر وغیرہ مجروح ہوتے رہے اور ادھر پولس خود اپنی حفاظت میں لگ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولس ہی یونیورسٹی کے لئے قیامت صغریٰ بن گئی۔

ہم نے اوپر واقعہ کا جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کا مقصد طلبا کے جرم کو ہلکا کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اُن بعض چیزوں کو بھی منظر عام پر لانا ہے جن سے اس واقعہ کے پیش آنے میں مدد ملی۔ خلیل جبران نے اپنے ایک ناول میں بڑا بلیغ فقرہ لکھا ہے:

Not a single leaf falls down without the silent consent of the whole tree.

یعنی ایک پتہ بھی پورے درخت کی خاموش رضامندی کے بغیر نہیں گرتا۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر یہ فقرہ صادق آتا ہے اور اس بنا پر جب تک حالات کا جائزہ اس وسعتِ نظر اور دقّتِ نگاہ سے نہیں لیا جائے گا اس وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دو ماہ کے بعد ہی ۲۷ اپریل ۴۹ء کو جب کلکتہ مدرسہ میں ایک بہت بڑا فساد ہو گیا جس میں بنگالی اور بہاری (اردو بولنے والے) طلبا ریں لاٹھیوں اور چاقوؤں سے کھلی جنگ ہوئی اور اس کی خبر پاکر پولس کے بڑے بڑے افسر خود آ گئے تو ان کے سخت اصرار کے باوجود نہ میں نے ان کو دخل دینے کی اجازت دی اور نہ کسی طالب علم کو گرفتار ہونے دیا، اور خود طلباء کے مجمع میں ایک پرزور تقریر کر کے اس ہنگامہ کو اس طرح ختم کیا کہ گورنمنٹ نے داد دی، اخبارات نے شذرے لکھے، پبلک نے تعریف کی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک ملاقات میں مسرت کا اظہار فرمایا۔

تک مشکلات کا کامیاب اور پائدار حل دریافت نہیں کیا جاسکتا۔

واقعہ کے اثرات مابعد

واقعہ تو ایک ارشدنی تھا جو یونیورسٹی کی بدقسمتی سے پیش آکر رہا لیکن یونیورسٹی کی کایا پلٹ کر کے رکھ گیا۔ جہاں تک نواب صاحب کی ذات کا تعلق ہے۔ مجھکو ان کی شرافت اور علو اخلاق میں شبہ نہیں ہے، چنانچہ جب طلبار نے اس پر اپنے رنج وغم اور افسوس کا اظہار کیا تو انھوں نے ان کو معاف کربھی دیا، لیکن انھوں نے جو بیان دیا تھا اس کی اور خفیہ پولس کی رلپورٹ کی بنیاد پر گورنمنٹ نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور اس سلسلہ میں مسٹر چھاگلہ جو وزیر تعلیم تھے انھوں نے فوراً یہ کیا کہ یونیورسٹی کا ایکٹ ۱۹۵۱ء منسوخ کر کے ایک آرڈیننس نافذ کر دیا۔ اس آرڈیننس کے ماتحت کورٹ اور اکزکٹو کونسل کی وہ ہیئت ترکیبی ختم ہوگئی جو ایکٹ ۱۹۵۱ء کے ماتحت انھیں حاصل تھی اور آرڈیننس کی روسے اور نامزدگی کے ذریعہ کورٹ اور اکزکٹو کونسل کی تشکیل کی گئی، ایک شخص یہ پوچھ سکتا ہے کہ اس کی ضرورت کیا تھی ؟ یونیورسٹیوں میں آج کیا کچھ نہیں ہورہا ہے، لاکھوں روپیہ کی گورنمنٹ پراپرٹی دیکھتے دیکھتے خاک کا ڈھیر کردی جاتی ہے۔ اور قتل اور زنا بالجبر تک کے واقعات پیش آتے ہیں لیکن کیا یونیورسٹی ایکٹ وہاں بھی منسوخ ہوتا ہے ؟ پھر کیا ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کے ماتحت کورٹ کے اور اکزکٹو کونسل کے جو ممبر منتخب کردہ یا نامزد کردہ تھے ان کی مدد سے یا کسی قسم کے ان کے ایما یا اشارہ پر یہ فتنہ برپا ہوا تھا، یا اس فتنہ کا سبب ایکٹ تھا ؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس واقعہ کا ایکٹ سے تعلق ہی کیا تھا ؟ اس کی توجیہ وتعلیل اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ یونیورسٹی کا اسلامی کردار جو کچھ بھی تھا اور اس بنا پر یونیورسٹی کو دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں جو امتیاز تھا۔ وزیر تعلیم اُس پر ادھار کھائے بیٹھے تھے، اس لئے انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ ایکٹ کی منسوخی اور آرڈیننس کے نفاذ کا حکم صادر کردیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں انھوں نے بارہا اپنے بیانات میں یہ بھی کہا کہ "مسلم" کا لفظ یونیورسٹی سے خارج کردیا جائے گا۔ مجھکو یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ ان کو اس طرح کا اقدام کرنے اور

بڑھ بڑھکر اس قسم کی بے سروپا اور لایعنی باتیں کرنے کی جرأت صرف اس لئے ہوئی کہ جانتے تھے کہ یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے اور مسلمانوں پر تقسیم کی وہ مار پڑی ہے کہ خدا دشمن کو نصیب نہ کرے، تو پھر وہ بھی ان پر وار کر کے شاہ مدار کا اعزاز حاصل کیوں نہ کریں چنانچہ اپنے موقف کو مبنی بر انصاف ثابت کرنے کی غرض سے انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کی نسبت بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا لیکن جب ان لوگوں نے آنکھیں دکھائیں تو چپ سادھ کر بیٹھ گئے، اور آخر انجام یہ ہوا کہ وزارت سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ چھاگلہ صاحب نے جس وقت مسلم یونیورسٹی کے متعلق یہ اقدام کیا ہے اس وقت لال بہادر شاستری جی دہلی میں موجود نہیں تھے۔ جب وہ واپس آئے اور انھیں ان سب چیزوں کا علم ہوا تو انھوں نے چھاگلہ صاحب کے اقدام کے خلاف سخت ناراضگی اور بیزاری کا اظہار فرمایا۔ لیکن ہر گورنمنٹ کو اپنے وقار کا لحاظ ہوتا ہے تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس لئے جو آرڈیننس نافذ ہو گیا تھا وہ تقضائے مبرم ہو کر یونیورسٹی پر مسلط ہو گیا۔

گرفتاریاں اور مقدمات یوپی گورنمنٹ نے یہ کیا کہ یونیورسٹی میں بڑی تعداد میں پولس متعین کر دی جو فیض گیٹ اور مولانا آزاد لائبریری کے پیچھے ڈیڑھ دو برس فروکش رہی، اور جب دو ماہ تک سین نرسنگ ہوم میں قیام کے بعد جناب وائس چانسلر صاحب علی گڑھ تشریف لائے تو ان کی قیام گاہ پر بھی گارڈ مقرر کر دیا۔ علاوہ ازیں طلباء کی یونین کی پوری کیبنٹ گرفتار ہو گئی، ان کے ساتھ شاید کچھ اور لڑکے بھی گرفتار ہوئے جو کافی مدت تک حوالات میں رہے۔ آخر گورنمنٹ نے مقدمات واپس لے لئے اور یہ سب بغیر سزا کے رہا ہو گئے، لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک جو بات ہوئی وہ یہ تھی کہ جسٹس بشیر احمد سعید صاحب اور مجتبیٰ حسن صاحب جو واقعہ کے پیش آنے کے وقت یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے یہ دونوں حضرات بھی گرفتار ہوئے مگر ان کی ضمانتیں منظور ہو گئیں اور مقدمات چلنے لگے۔ یہ دونوں حضرات ذاتی طور پر میرے بڑے کرم فرما اور مہربان دوست تھے لیکن اس کے باوجود جب یہ دونوں مقدمہ کی پیشی کے سلسلہ میں علی گڑھ آئے

یا لائے گئے ہیں تو یہ منظر اس درجہ حسرت آفریں اور رقت انگیز تھا کہ میں نے ہر چند کوشش کی۔ لیکن ان دونوں کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ گورنمنٹ نے آخر ان پر سے بھی مقدمات اٹھا لئے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ گورنمنٹ نے اپنی خفیہ پولیس کے ان افسروں کے خلاف کیا کارروائی کی جن کی رپورٹ کی اساس پر بلک کے ان دو معزز اشخاص پر مقدمات قائم کئے گئے اور جن کے باعث ان کو ہر قسم کی ذہنی، روحانی اور جسمانی اذیت اور کرب و اضطراب سے گزرنا پڑا۔ والی اللہ المشتکی

ڈاکٹر عبدالبصیر مرحوم

کوئی زخم خواہ کتنا ہی گہرا اور حوادث زمانہ کا دیا ہوا کوئی داغ کیسا ہی اجاگر ہو امتداد روزگار کا یہ کرشمہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ زخم مندمل اور داغ بھی دھندلا ہونے لگتا ہے، لیکن اتنے برس بیت جانے پر بھی میں جس غم کو اب تک نہیں بھلا سکا ہوں وہ اپنے عزیز دوست ڈاکٹر عبدالبصیر کا غم ہے جن کی زندگی اس واقعہ کی بھینٹ چڑھ گئی، اور اس کی وجہ سے پورا ایک گھرانہ تباہ ہو گیا، موصوف کی عمر چالیس پینتالیس برس کے درمیان ہو گی۔ یونیورسٹی میں شعبۂ علم الحیوانات (zoology) کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے اور اپنے فن میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے، جس روز یہ واقعہ پیش آیا ہے اُس سے دو تین ماہ قبل انھوں نے مجھکو امریکہ کی مشہور ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک خط دکھایا تھا جس میں ان کو دو ہزار ڈولر ماہانہ تنخواہ پر پروفیسر شپ کی پیش کش کی گئی تھی، میں نے اصرار کیا کہ آپ اسے ضرور قبول کر لیجیے، لیکن انھوں نے اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کہنے لگے: سوچوں گا۔ گھر کے دولتمند اور خوش حال تھے دودھ پور میں اُن کی نہایت وسیع و عریض اور شاندار کوٹھی "نور منزل" کے نام سے تھی اُس میں رہتے تھے، اپنے فن میں غیر معمولی قابلیت اور شہرت کے ساتھ اخلاق و عادات اور کردار کے اعتبار سے بھی پکے اور سچے مسلمان تھے، زیدی صاحب کے زمانہ میں پراکٹر بھی رہے تھے۔ اپنے علمی و عملی اوصاف و کمالات کے باعث طلبار میں بڑے ہر دلعزیز تھے

اس واقعہ کے سلسلہ میں یہ بھی پکڑے گئے اور آگرہ جیل میں رکھے گئے، اگرچہ بعد میں یہ بھی

رہا ہوگئے اور مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ لیکن مرحوم نہایت ذکی الحس (Sensitive) اور بیحد منفعل طبیعت کے انسان تھے، سینکڑوں انسانوں کی طرح ان کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس معاملہ میں قطعاً بے گناہ اور بے خطا ہی نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر نواب صاحب کی حفاظت کی اور اُن کی جان بچائی تھی، ....

.... لیکن اس واقعہ نے ایک عجیب صورت یہ اختیار کرلی تھی کہ ہر ترقی پسند اور سکولرزم کا پرستار آج معصوم و بے گناہ اور ہر پختہ عقیدہ اور عمل کا مسلمان حکومت کی نظر میں مجرم! اور اگر مجرم نہیں تو مشتبہ ضرور! اس بنا پر ڈاکٹر عبدالبصیر کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ صرف پکے سچے مسلمان اور طلبا میں بیحد ہر دلعزیز ہونے کے جرم میں پکڑے گئے ہیں :

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں

پھر گرفتاری کے وقت اور حوالات میں ان کو جو ذہنی اور روحانی سخت تکالیف پہونچیں ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ غم ان کے دل میں بیٹھ گیا اور (ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق) یہی غم کینسر بن کر آخر انھیں کہا گیا۔ جب معلوم ہوا کہ انھیں کینسر ہے تو رہا کردیا گیا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اس کا واپس آنا انہونی بات تھی۔ علاج کے لئے وہ بمبئی بار بار گئے، مہینوں پڑے رہے۔ روپیہ پانی کی طرح بہا۔ سب ہی کچھ ہوا۔ لیکن جو اچھا ہو جائے وہ کینسر ہی کیوں ہونے لگا۔ قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہا۔ آخری مرتبہ جب بمبئی سے آئے اور میں ان سے ملا تو اگرچہ وہ کچھ خوش امید تھے، لیکن میں نے ان کا چہرہ دیکھتے اور ان کے حالات سنتے ہی تاڑ لیا تھا کہ اب وقت قریب ہے۔ چنانچہ میں قاہرہ میں تھا کہ وہاں کے اخبارات میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی اور جی دھک سے ہو کر رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔